رضوان اللہ

عنِ ''البیان''

[''عنِ البیان'' کے عنوان سے یہ ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اس میں اُن سوالات کو زیر بحث لایا جائے گا جو غامدی صاحب کی کتاب ''البیان'' کے ذیل میں محض تفہیم مدعا کی غرض سے پوچھے جاتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ!]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لَمْ یَحِضْنَ میں لَمْ کی دلالت

ایک آیت میں عدت کا حکم اس طرح سے بیان ہوا ہے:

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْھُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ. (الطلاق ۶۵: ۴)

''تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں، اور وہ بھی جنھیں (حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود) حیض نہیں آیا، ان کے بارے میں اگر کوئی شک ہے تو ان کی عدت تین مہینے ہو گی۔''

''البیان'' میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

''اصل میں 'وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'لَمْ' عربی زبان میں نفی جحد کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا اِس سے وہ بچیاں مراد نہیں ہو سکتیں جنھیں ابھی حیض آنا شروع نہیں ہوا، بلکہ وہی عورتیں مراد ہوں گی جنھیں حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود حیض نہیں آیا۔'' (۵/ ۲۳۲)

اس پر سوال ہوا ہے کہ عربی زبان میں 'لَمْ' کا حرف نفی کے لیے آتا ہے اور یہاں 'لَمْ یَحِضْنَ' کا مطلب بس اتنا ہے کہ جنھیں حیض نہیں آیا۔ چنانچہ اس سے مراد بچیاں بھی ہو سکتی ہیں اور بڑی عمر کی عورتیں بھی۔ مگر کیا وجہ ہے کہ ''البیان'' میں صرف 'لَمْ' کی بنیاد پر نہایت قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کر دیا گیا ہے کہ اس سے مراد بچیاں ہر گز نہیں ہو سکتیں؟

سوال کے جواب میں پہلی بات یہ واضح ہو جانی چاہیے کہ 'لَمْ' محض نفی کے لیے نہیں ہوتا کہ اس کے لیے عربی زبان میں 'ما' کا حرف ہوتا ہے، بلکہ اس کی نفی میں 'ما' سے زیادہ شدت پائی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے نفی جحد، یعنی انکار والی نفی کہا جاتا ہے۔ اب یہ انکار چونکہ کئی پہلوؤں سے ہو سکتا ہے، اس لیے زبان میں اس کے ایک سے زائد استعمالات ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر، کبھی مقصود ہوتا ہے کہ فعل کی نفی کرتے ہوئے اس میں اتنی شدت پیدا کر دی جائے کہ اس کے بارے میں ہر عقلی امکان کا بھی انکار ہو جائے۔ ذیل کی آیت میں یہ اسی لحاظ سے آیا ہے:

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ. (الاخلاص ۱۱۲: ۳) ''وہ نہ باپ ہے نہ بیٹا۔''

یہ امکان اگر حقیقی ہو تو بعض اوقات اندیشے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کی نفی کرنے کے لیے بھی 'لَمْ' لایا جاتا ہے، جیسا کہ اُحد کے بعد کی مہم میں اس بات کا سخت اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کو کوئی بڑا نقصان پہنچ جائے، مگر فرمایا ہے:

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ. (آل عمران ۳: ۱۷۴) ''سو وہ اللہ کی نعمت اور اس کا فضل لے کر (اِس مہم سے) واپس آئے، ان کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔''

فعل کی نفی کرتے ہوئے یہ وقت کے مفہوم پر بھی مشتمل ہو جاتا ہے اور کبھی صرف ماضی میں اور کبھی ماضی سے لے کر حال تک میں اُس فعل کا انکار کر دیتا ہے۔ اول الذکر کی مثال یہ آیت ہے:

هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْـًٔا مَّذْكُوْرًا. (الدھر ۷۶: ۱) ''کیا انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔''

ثانی الذکر کی مثال یہ ہے:

لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِیًّا. (مریم ۱۹: ۴) ''اور اے پروردگار، تجھ سے مانگ کر میں کبھی محروم نہیں رہا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وقت کے اسی مفہوم کی رعایت ہوتی ہے کہ اسے کسی متوقع بات کی نفی کے لیے بھی برت لیا جاتا ہے۔ یہ بات ماضی میں بھی ہوتی ہے اور مستقبل میں بھی۔ یعنی اس کے ذریعے سے اُس بات کی نفی بھی کی جاتی ہے جس کی اس سے پہلے امید کی جا رہی تھی اور اس سے اُس بات کی توقع بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ جس کی اب نفی کر دی گئی ہے[1]۔ پہلے کی مثال میں وہ آیت دیکھ لی جائے جس میں فرمایا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں خراب نہیں ہوئیں، حالاں کہ ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ وہ گل سڑ جاتیں:

فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ. (البقرہ ۲: ۲۵۹) ”اب ذرا اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو، ان میں سے کوئی چیز سڑی نہیں۔“

دوسرے کی مثال میں وہ آیت دیکھ لی جائے جس میں فرمایا ہے کہ ہم نے تمھیں اُس زمین کا بھی وارث بنا دیا ہے جس پر تمھارے قدم نہیں پڑے، مطلب یہ کہ آنے والے وقت میں امید ہے کہ ایسا ہو جائے:

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا. (الاحزاب ۳۳: ۲۷) ”اور اُن کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا تمھیں وارث بنا دیا اور ایک ایسی زمین کا بھی جس کو تمھارے قدموں نے چھوا بھی نہیں ہے۔“

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حرف ’لَمْ‘ کے یہ تمام استعمالات اس میں اصلاً موجود ہوتے ہیں، مگر کس مقام پر کون سا پہلو مراد لیا گیا ہے، یہ جاننے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ سب سے پہلے کلام کے فحوا کو معلوم کیا جائے۔ سو اس نظر سے دیکھا جائے تو بہ ادنیٰ تامل واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں طلاق دی ہوئی عورتوں کی عدت بیان ہو رہی ہے۔ اب عدت کی پابندی چونکہ اولاد کی وجہ سے ہوتی ہے کہ جس کا امکان بچیوں کے معاملے میں بالکل نہیں ہوتا، اس لیے طے ہے کہ یہاں صرف وہ عورتیں مراد ہیں جو اولاد پیدا کرنے کی عمر میں ہیں۔ مزید یہ کہ ’وَالّٰٓـِٔیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ‘ میں حیض سے مایوس عورتوں کا بیان ہو چکا ہے، اس لیے ’وَّالّٰٓـِٔیْ لَمْ یَحِضْنَ‘ میں لازماً اُن عورتوں کا ذکر ہے جو اولاد پیدا کرنے کی عمر میں تو ہیں، مگر غیر آئسہ ہیں۔ اب ان عورتوں کے بارے میں جب یہ کہا جائے: ’لَمْ یَحِضْنَ‘ تو اسے پڑھ کر یہی متبادر ہوتا ہے کہ ’لَمْ‘ یہاں محض نفی کے لیے نہیں، بلکہ ماضی میں متوقع فعل کی

۱۔ وقت کے مفہوم سے توقع کا معنی کس طرح سے پیدا ہوتا ہے، اس کے لیے اردو زبان میں ’ابھی‘ کا استعمال دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ یعنی اگر کہا جائے کہ یہ کام ابھی نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کام متوقع تھا، مگر ابھی تک نہیں ہوا۔ اور اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کام ابھی تو نہیں ہوا، مگر اس کے ہونے کی توقع ضرور ہے۔

نفی کے لیے آیا ہے اور اب اس میں وہی عورتیں مراد ہیں جو غیر آئسہ ہیں اور اولاد پیدا کرنے کی عمر میں بھی ہیں، مگر اُنھیں ابھی تک حیض نہیں آیا۔

بلکہ ہم عرض کریں کہ 'لَمۡ یَحِضۡنَ' کا جو مطلب فحوائے کلام کی دلالت اور حرف 'لَمۡ' کی تعیین سے واضح ہوتا ہے، اس کی تائید میں مزید قرائن بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اُن کے بارے میں 'اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ' کے الفاظ آئے ہیں[۲]، یعنی یہ عدت اُس صورت میں ہے جب اُن سے خلوت ہو چکی ہے اور اس وجہ سے شک پیدا ہو گیا ہے کہ انھیں حیض نہ آنے کے باوجود شاید ان کے رحموں میں کچھ ہو۔ ظاہر ہے، یہ بات بھی چھوٹی بچیوں کے بجاے بڑی عمر ہی کی عورتوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ 'وَّالّٰٓـِٔیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ' کے 'وَّالّٰٓـِٔیۡ' کو کھول دیں تو اب اس کی تالیف یہ بنتی ہے: 'وَّالّٰٓـِٔیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ'۔ اس میں 'تمھاری عورتوں' کے الفاظ بذات خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہاں بڑی عورتوں کا ذکر مقصود ہے، اس لیے کہ شادی اور طلاق کے پس منظر میں ان الفاظ کا مطلق استعمال چھوٹی عمر کی بچیوں کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔

اب جہاں تک ''البیان'' میں لکھے گئے وضاحتی نوٹ کا معاملہ ہے تو ہم عرض کریں کہ اس کے پیچھے مذکورہ بالا یہ تمام دلائل موجود ہیں، البتہ اس میں صرف 'لَمۡ' کی دلالت کے ذکر پر اس لیے اکتفا کر لیا گیا ہے کہ مصنف کے نزدیک ہر حرف کے مرادی پہلو کی تعیین اور اس کے دلائل کو ہر ہر مقام پر بیان کرنا ضروری نہیں ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے اس کتاب میں جب 'لَمۡ' کے دیگر پہلوؤں کو بھی اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ بالعموم اُن کی تعیین کے دلائل بیان نہیں کیے جاتے۔

بیان تخلیق میں حیرت کا پہلو

انسان کی پیدایش کا بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِیۡ قَرَارٍ مَّكِیۡنٍ. ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً

۲۔ یہاں کسی کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ 'اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ' کے الفاظ 'وَّالّٰٓـِٔیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ' کے ساتھ مذکور نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ لفظوں میں چاہے نہ ہوں، مگر اس کے حکم میں ہر طرح سے موجود ہیں۔

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ.(المؤمنون ۲۳: ۱۳-۱۴)

ان آیات کے تحت ''البیان'' میں یہ وضاحت کی گئی ہے:

''یہ دوسرے مرحلے کا ذکر ہے جس کے بعد انسان ماں باپ کے پیٹ سے پیدا ہونا شروع ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں۔ اِس کی جو تفصیل آگے بیان ہوئی ہے، وہ معلوم و معروف ہے۔ دور جدید کا انسان اپنے مشینی مشاہدات کی بدولت اِس کی جزئیات تک سے واقف ہو گیا ہے۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ اُس نے صدیوں پہلے جو کچھ کہا تھا، وہ حیرت انگیز طور پر اُس کے مشاہدات کے عین مطابق ثابت ہوا ہے۔''(۳/ ۳۸۴)

اس وضاحت پر سوال ہوا ہے کہ قرآن اپنے مخاطبین پر ان کے موجود علم کی بنیاد پر اتمام حجت کرتا ہے، اس لیے طے ہے کہ جب ان کے سامنے پیدایش کے ان مراحل کا ذکر کیا گیا تو وہ ان سے پہلے ہی سے واقف تھے۔ مزید یہ کہ سائنسی مشاہدات کے ذریعے سے جو نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں، وہ بھی قرآن کے کسی بیان کی نہیں، بلکہ اُسی ابتدائی علم کی تفصیل ہیں۔ چنانچہ سوال یہ ہے کہ اس تفصیل کی قرآن کے ساتھ مطابقت کو ''البیان'' میں قرآن کا اعجاز کیوں کہا گیا اور اسے حیرت انگیز کیوں قرار دے دیا گیا ہے؟

یہاں ایک بنیادی بات واضح ہو جانی چاہیے۔ اس طرح کی تمام آیات کے معاملے میں اہل علم کے ہاں دو انتہائی رویے پائے جاتے ہیں: ایک یہ کہ ہر آنے والی سائنسی تحقیق کا سہرا قرآن کے سر باندھ دیا جائے اور کہا جائے کہ یہ سب تو اس کتاب میں چودہ سو سال پہلے بیان ہو چکا۔ دوسرے یہ کہ قرآن اپنے مخاطبین کی ہدایت کے لیے صرف اُن حقائق کو بیان کرتا ہے جن کا وہ پہلے سے علم رکھتے ہوں، اس لیے کہ اُس علم ہی کی وجہ سے اُن پر دلیل قائم ہوتی اور اتمام حجت ہوا کرتا ہے[۳]۔ ہم عرض کریں گے کہ حق بات ان دو انتہاؤں کے درمیان میں ہے۔ وہ یہ کہ قرآن اپنی اصل میں ہدایت کی کتاب ہے، اس لیے حصول علم کے بجاے حصول ہدایت کو ہدف بنا کر اس میں مضامین بیان ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ کسی انسان کی تصنیف کردہ کوئی کتاب نہیں، بلکہ تمام عالموں کے پروردگار کی طرف سے اُتاری ہوئی ایک کتاب ہے، چنانچہ اس میں نہ صرف مخاطبین کے موجود علم کی رعایت کی جاتی ہے، بلکہ بارہا اُن کے علم میں وہ باتیں بھی لائی جاتی ہیں جن سے وہ ناواقف محض

۳۔ واضح رہے کہ اتمام حجت صرف مخاطبین کو حاصل مشاہداتی علم کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ اس کی اور بھی کئی بنیادیں ہوتی ہیں کہ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

ہوتے ہیں۔ یہ باتیں جس طرح آخرت کی دنیا سے متعلق ہوتی ہیں، اسی طرح دنیا اور اس کے احوال کے بارے میں بھی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن نے انسان کی پیدایش مٹی اور ماں باپ کے ذریعے سے ہونے کے جب دو مرحلے بیان کیے ہیں [۴] یا چھ مختلف ادوار میں کائنات کو بنانے کا ذکر کیا ہے [۵] یا ہمارے زمین و آسمان کے علاوہ چھ مزید زمین و آسمان کے موجود ہونے کا بیان کیا ہے [۶] تو یہ اصل میں اپنے مخاطبین کے علم میں اضافہ ہی کیا ہے۔ سو قرآن کی تفہیم میں اس مغالطے کو ہرگز راہ نہیں دینی چاہیے کہ اس میں مخاطبین کے سامنے صرف اُن باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اُس زمانے میں اُن کے اپنے علم میں تھیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان آیات میں وہ کیا چیز بیان ہوئی ہے جسے ''البیان'' میں معجزہ اور حیرت انگیز قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک وہ دو باتیں ہیں، اور ان میں سے اول بات کو سمجھنے کے لیے ہم پہلے ایک سادہ مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کیجیے، کارخانے کے بند کمرے میں ایک خودکار مشین پر کپڑا تیار ہو رہا ہے۔ عام طور پر، اس میں سے کپڑا تیار حالت میں باہر نکلتا ہے، مگر کبھی کبھار اس میں سے ویسٹیج بھی باہر آتی ہے جو کبھی دھاگے کی شکل میں ہوتی ہے تو کبھی آدھ بنے ہوئے کپڑے کی شکل میں۔ کمرے سے باہر ایک بچہ کھڑا ہے اور اُس کا علم بس اتنا ہے کہ وہ مشین سے نکلنے والی کپڑوں کی ان مختلف صورتوں سے واقف ہے۔ ظاہر ہے، وہ اپنے اس علم کی بنیاد پر کبھی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کپڑا کس طرح سے بنتا ہے۔ یہ بتانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس کمرے کے اندر دیکھ لینے کی صلاحیت ہو۔ اب مشین کو آپریٹ کرنے والا شخص اسے بتاتا ہے کہ بیٹا، یہ کپڑا اِس مشین پر میں تیار کرتا ہوں اور اس کے بعد اسے دھاگے سے لے کر کپڑا بننے تک کا پورا عمل بھی بتاتا ہے کہ پہلے میں دھاگا لیتا ہوں، اسے تانے بانے کی شکل دیتا ہوں اور اسے مشین پر چڑھا کر آخر کار کپڑے کی صورت دے دیتا ہوں۔ واضح سی بات ہے کہ اس شخص کی بتائی ہوئی یہ تفصیل اُس بچے کے لیے ایک بالکل نئی بات ہو گی اور یہ جاننے کے باوجود نئی بات ہو گی کہ ایک دھاگا ہوتا ہے، ایک تانا بانا اور ایک کپڑا۔ اب فرض کیجیے اس بچے سے یہ ساری تفصیل ایک دوسرے بچے نے سن رکھی ہے اور اُس دوسرے کو یہ موقع بھی مل جاتا ہے کہ وہ اس کمرے میں جھانک کر خود اپنی آنکھوں سے یہ سارا عمل دیکھ لے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب دیکھ لینے کے

۴۔ السجدہ ۳۲: ۷-۹۔

۵۔ حٰمٓ السجدہ ۴۱: ۱۲۔

۶۔ الطلاق ۶۵: ۱۲۔

بعد وہ انتہائی حیرت میں جا پڑے گا کہ میں نے جھانک کر دیکھا تو جانا، مگر اس نے بنا دیکھے کس طرح سے اسے جان لیا۔

اسی طرح کی بات ان آیات میں بیان ہوئی ہے۔ اُس زمانے کے اہل عرب 'علقة' سے بھی واقف تھے اور 'مضغة' اور 'عظام' سے بھی کہ یہ اُن کی اپنی زبان میں استعمال ہونے والے عام الفاظ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان میں سے جنین پہلے اور بوٹی اور ہڈیوں کے مرحلے بعد میں ہوتے ہیں کہ ان کے گرد و پیش میں مختلف ارتقائی عمل واقع ہو رہے اور خود اُن کے اپنے درمیان میں اِسقاط حمل کے کئی واقعات رونما ہو رہے تھے[۷]۔ مگر اس جزئی اور نتیجوں کے علم کی بنیاد پر وہ اس حیثیت میں ہرگز نہ تھے کہ انسان کے تخلیق ہونے کا عمل بھی بتا سکیں[۸]۔ اور بفرض محال، اگر وہ اپنے ان مشاہدات کی بنا پر اندازہ کرتے ہوئے یہ بتا بھی دیتے تو اس میں شک نہیں کہ اس میں درست اور غلط ہونے کے احتمالات اُس وقت تک موجود رہتے، جب تک کسی یقینی ذریعے سے اسے جان نہ لیا جاتا۔ قرآن نے اصل میں یہ کیا ہے کہ اُس زمانے کے موجود علم سے آگے بڑھ کر انسان کی تخلیق کا یہ عمل بنا کسی تردد کے بیان کر دیا ہے اور مزید یہ ہوا ہے کہ جو کچھ اس نے بیان کیا، اُس کی جدید علم میں تردید کے بجاے تصدیق بھی ہو گئی ہے۔ اب ظاہر ہے، سائنسی علوم کے ماہرین کے لیے آج یہ بات حد درجہ حیرت کا باعث ہو جائے گی کہ صدیوں پہلے اس عمل کو کس طرح سے جان لیا گیا، اور مزید برآں یہ کہ اِس کامل درستی کے ساتھ اسے کس طرح سے بیان کر دیا گیا۔ سو قرآن کا یہی اعجاز ہے اور سائنس کے طلبہ کی یہی حیرت ہے کہ جس کا ''البیان'' میں ذکر کیا گیا ہے۔

یہاں ہو سکتا ہے کہ قرآن کے اسلوب سے اجنبیت کی وجہ سے بعض لوگوں کے لیے اس تخلیقی عمل کے بیان کو اپنی گرفت میں لے لینا ذرا مشکل ہو اور اس لیے ''البیان'' میں بیان کردہ حیرت کا ذکر بھی ان کے لیے اب تک ناقابل فہم ہو۔ اس پر ہم گزارش کریں گے کہ وہ مذکورہ آیات کا بار بار مطالعہ کریں اور اس ذیل میں یہ

۷۔ اور یہی چیزیں ہیں جنھیں ''البیان'' میں ''معلوم و معروف'' قرار دیا گیا ہے۔

۸۔ جدید تعلیم سے دور اور خالص دیہاتی ماحول میں بچہ جنانے والی کوئی عورت اِس معاملے میں پرانے زمانے کے اہل عرب کے بالکل برابر ہے۔ وہ بھی صرف یہ بتائے گی کہ اُس نے ابتدا سے لے کر انتہا تک بچوں کی فلاں اور فلاں صورتیں دیکھ رکھی ہیں، مگر اس بنا پر وہ کبھی آپ سے یہ نہیں کہے گی کہ آؤ، میں تمھیں بتاؤں کہ بچے کی تخلیق کا عمل کس طرح سے ہوتا ہے۔

بات بھی سامنے رکھیں کہ ان آیات میں یہ نہیں بتایا گیا کہ ایک جنین ہوتا ہے اور ایک بوٹی اور ایک اُس کی ہڈی۔ نہ یہ بتایا گیا ہے کہ ان میں سے جنین انسان کی بالکل خام اور بوٹیاں اور ہڈیاں اُس کی پختہ صورت ہوتے ہیں، بلکہ اس میں انسان بننے کا پورا عمل بیان کیا گیا ہے جو ایک حقیر نطفے سے شروع ہوتا اور مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے ایک جیتا جاگتا انسان بن جانے پر منتج ہوتا ہے۔ ان میں تخلیق کے عمل کا بیان ہوا ہے، اس بات کی دلیل اگرچہ 'وَلَقَدْ خَلَقْنَا' اور 'اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ' کے الفاظ بھی ہیں کہ جن میں سے اول الذکر تو یہ بتاتے ہیں کہ یہاں خدا کے خالق ہونے کا بیان ہو رہا ہے، مگر ثانی الذکر بتاتے ہیں کہ تخلیق کس طرح سے ہوتی ہے، یہاں اس کا بھی بیان ہو رہا ہے۔ سیاق میں اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ مذکورہ آیات میں بعد از موت زندگی کے منکرین کو جواب دیا گیا ہے کہ ہم اسے دوبارہ زندگی دے دینے پر بھی قادر ہیں، سو واضح کیا گیا ہے کہ ہم ہی ہیں جو آج بھی اسے بناتے اور اس طریقے سے بناتے ہیں۔ تاہم اس بات کی اصل دلیل ذیل کے جملوں اور ان کی ساخت میں پائی جاتی ہے جو ہر طرح سے واضح کر رہے ہیں کہ ان کے ذریعے سے یہاں تخلیق کے عمل ہی کا بیان ہوا ہے:

''پھر پانی کی اس بوند کو ہم نے ایک جنین کی صورت دی اور جنین کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا اور لوتھڑے کی ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ سو بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا۔''

دوسری چیز کہ جسے حیرت انگیز قرار دیا جا سکتا ہے، وہ ان آیتوں میں بیان کردہ بعض معلومات ہیں۔ اُس زمانے کے اہل عرب یہ بات تو جانتے تھے کہ بچہ جسم اور روح کا مجموعہ ہوتا ہے اور یہ روح اُن کے نزدیک مختلف صلاحیتوں، جیسا کہ سننا اور سوچنا وغیرہ کا ذریعہ تھی، مگر وہ اس بات میں ہرگز واضح نہیں تھے کہ یہ جسم اور صلاحیتیں ایک ہی وقت میں تخلیق پاتے ہیں یا اس عمل میں ایک ترتیب ہوتی ہے۔

قرآن نے 'ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ' کے الفاظ لا کر واضح کر دیا ہے کہ ماں کے پیٹ میں پہلے بچے کے حیوانی وجود کی تکمیل ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جب اسے انسانی درجے کی صلاحیتیں عطا کی جاتی ہیں۔ آج یہ بات ہمارے لیے باعث حیرت ہے، جب ہمیں بھی مختلف ذرائع سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ماں کے پیٹ میں واقعتاً جسم کی اصل تیاری کے بعد ہی وہ مرحلہ آتا ہے جب بچہ سننا اور سوچنا، بلکہ سیکھنا بھی شروع کر دیتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

آخر میں ہم عرض کریں گے کہ صاحب ''البیان'' چونکہ اختصار اور جامعیت کے ساتھ لکھنے کے عادی ہیں، اس لیے انھوں نے قاری کی ذہانت پر اعتبار کرتے ہوئے اپنے وضاحتی نوٹ میں بعض تصریحات کو چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر یہ تصریحات لفظوں میں بیان کر دی جاتیں تو زیر بحث سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com